طارق محمود

دکن میں اُردو تحقیق کی روایت-ایک جائزہ

Dakan was the centre of educational, literary and research activites from the beginning. Here the governemnt has also been patronising educational and literary activities. Dakan is given much importance as birth place of Urdu language and literature. In the same way, Urdu research also begins from here. In this article, we discuss the theories of beginning of Urdu language and their role to strenghten the tradition of Urdu research. Besides this, different schools of thoughts, (Lahore, Azam Garh, Ram Pur, Patana) their prominent researchers and the tradition of research in Hyderabad Dakan have been discussed briefly.

زبان انسان کی سماجی زندگی کی اہم ضرورت اور انسانی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔اس کے بغیر انسان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔اسی لیے انسان کو حیوانِ ناطق کہا جانے لگا کیوں کہ زبان اور معاشرے کا رشتہ اٹوٹ اور ہمیشہ جاری رہنے والا ہوتا ہے۔زبان کے بغیر کسی سماج کا اور سماج کے بغیر کسی زبان کا تصور کرنا محال ہے۔لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ زبان انسان کے تخیلات،نظریات اور قوتِ احساس کا ایک ایسا ریکارڈ جو انسان اور کسی روح کی تاریخ کے مانند ہے۔یوں بھی زبان کو فطری عمل سے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

زبان کو عام طور پر اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ہمارے سماجی رشتوں/رشتے زبان ہی کے ذریعے مستحکم ہوتے ہیں۔تمام علوم اسی کے سہارے وجود میں آتے ہیں۔ان علوم کی ترسیل،افہام و تفہیم اور تعلیم و تربیت کا ذریعہ یہ زبان ہی بنتی ہے۔

انسانی زندگی میں زبان کی اہمیت کے پیش نظر لوگ اس کی ماہیت سے دلچسپی لیتے آئے ہیں۔کسی بھی قوم کی قدیم ترین تاریخ کے مطالعے سے زبان کی اہمیت کی شعوری یا غیر شعوری ہوش مندی کی شہادتیں ملیں گی لیکن قدیم دور میں زبان کی ماہیت کا لسانی مطالعہ آج کے لسانی مطالعے سے اس لیے

Scanned by CamScanner

مختلف تھا کہ وہ دور سائنٹیفک نہیں تھا۔ آج کے سائنسی تہذیب میں پرورش پانے والا انسان زبان کا مطالعہ ''علم لسانیات'' کے تحت جدید سائنٹیفک اصولوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس علم کو سائنس قرار دینے کے حوالے سے نصیر احمد خاں لکھتے ہیں:

''جب ہم اس علم کو سائنس کہتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زبان کا مطالعہ روایتی انداز فکر سے ہٹ کر خالص منطقی دلائل کے ساتھ مکمل، منظم اور جامع واضح انداز میں کیا جاتا ہے۔''[۱]

لسانیات نے ہمیں یہ تصور دیا کہ زبان کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہیے۔ اس نے زبان کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لیے ہمیں نئے نظریات و تصورات دیئے۔ نئے طریق کار اور تجزیے کی نئی تکنیک سے بھی متعارف کرایا۔ لسانیات کا علم زبان کی ماہیت، توضیح اور روایتی نظریوں کے خلاف ردِ عمل تھا جب کہ ماہر لسانیات اس بات کو واضح کرتا ہے کہ زبان کس طرح عمل کرتی ہے۔ لسانیات کے ماہرین کی دلچسپی کا ایک موضوع یہ بھی رہا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین زبان کون سی ہے۔ جس کے لیے بہت سے محققین نے اپنی اپنی آراء و نظریات پیش کئے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی زبان کو لے لیں وہ تقریر، تحریر کی صورت میں مختلف مدارجِ ارتقاء طے کر کے اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ آج اس کی اصل یا آغاز کا مطالعہ ناممکن ہے۔ تاہم علم اللسان اور آثار قدیمہ کے ذریعہ سے کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ جنھیں مصدقہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے باوجود انسان زبان کے آغاز و ارتقاء/ ابتداء کے بارے میں جستجو کرتا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ یہ جاننے کا متمنی رہا کہ آخر زبان کا آغاز کیسے؟ کیوں کر؟ اور کب ہوا؟ یہی وجہ ہے کہ خطۂ ہندوستان میں اردو زبان بولنے والوں نے اردو زبان کی ابتداً اور آغاز کے بارے میں جاننے کے لیے مقدور بھر کوششیں کی ہیں اور خاص طور پر جب لسانیات کا علم تیزی سے پھیلا تو یہ کوششیں بھی تیز تر ہو گئیں کہ اردو زبان کا ماخذ کیا ہے؟ اس کا آغاز کس علاقے سے ہوا ہوگا؟ اس کی موجودہ شکل و صورت کس زبان کی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ یہ اور اس سے وابستہ بیسیوں سوال اردو کے ماہرین کی توجہ کا مرکز و محور بن گئے جس کے نتیجہ میں اردو کے آغاز سے متعلق بہت سے نظریات وجود میں آئے۔

اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشو و نما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرین لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی (پنجاب)، نصیر الدین ہاشمی (دکن) اور سیّد سلیمان ندوی نے (سندھ) کو اردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے جو نظریات پیش کئے انھیں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ کسی خاص خطے یا مقام سے اردو کو مخصوص کرنے کے پہلو بہ پہلو ماہرین کے لسانی نظریات بھی ملتے ہیں جنھوں نے اردو کا کسی خاص بولی یا زبان سے ناتہ جوڑا ہے۔ اس ضمن میں ''برج بھاشا (محمد حسین آزاد) قدیم ویدک بولی (ڈاکٹر شوکت سبزواری) ہریانی (ڈاکٹر مسعود حسین خان) مرہٹی (ڈاکٹر سہیل بخاری) دراوڑی (عین الحق فرید کوٹی) کے تصورات خصوصی

Scanned by CamScanner

اہمیت کے حامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر

''بیشتر لسانی مباحث بھی انھیں نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں۔'' [۲]

یہ نظریات درست ہیں یا غلط، ان کا تعین لسانی محققین کا کام ہے تاہم اتنا ہے کہ انھوں نے جدید ترین تحقیقات اور لسانی تصورات سے خصوصی استفادہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ زبان کے آغاز اور نشو ونما کے سلسلے میں بھی قابلِ قدر لسانی مواد جمع کر لیا۔ نظریات کی بناء پر نہیں تو کم از کم فراہمی مواد کے باعث، ان کا کام قابلِ توجہ قرار پاتا ہے۔ اردو کی ابتدا کے بارے میں محمد حسین آزاد (۱۸۳۲-۱۹۱۰ء) ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان ''برج بھاشا'' سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔'' [۳]

مولانا محمد حسین آزاد کے اس نظریے کا کسی زمانے میں علمی حلقوں میں بہت چرچا تھا اور برج بھاشا کو عام طور پر اردو کی ماں سمجھا جانے لگا۔ ان کے علاوہ کئی اور مصنفین (میر امن دہلوی، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور حکیم شمس اللہ قادری وغیرہ) نے ان سے پہلے اور بعد میں اردو کو برج بھاشا سے منسوب کرنے کے سلسلہ میں بنیادی نوعیت کا کردار ادا کیا۔ بہر حال اردو کے برج بھاشا سے تعلق کو آزاد کے نظریہ کے طور پر قبول نہیں کیا گیا۔ مرزا خلیل بیگ نے تو ثابت کیا ہے کہ اس نظریے کو سب سے پہلے ہیورنلے نے پیش کیا، وہ لکھتے ہیں:

''۔۔۔یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے برج سے ماخوذ ہونے کا نظریہ سب سے پہلے ہند آریائی لسانیات کے ایک بڑے ماہر روز ولف ہیورنلے نے پیش کیا تھا۔'' [۴]

ان کے علاوہ بھی اردو کے برج بھاشا سے نکلنے کے نظریے پر تنقید اور اس کی تردید مختلف محققین نے اپنی کتابوں ''پنجاب میں اردو'' (حافظ محمود شیرانی) ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' (پروفیسر مسعود حسین خان) ''داستان زبان اردو'' (ڈاکٹر شوکت سبزواری) میں نہایت مدلّل انداز میں کی ہے۔ ان محققین نے برج بھاشا اور اردو کے تقابلی مطالعے اور لسانیاتی تجزیے سے یہ بات پایہ تکمیل/ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ ان دونوں زبانوں میں ماں بیٹی کا رشتہ نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔

اردو کے آغاز و ارتقاء کا سلسلہ عام طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے یہاں قیام سے جوڑا جاتا ہے، جو درست نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کی آمد نے ہند آریائی زبانوں کی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا۔ اردو بھی ان میں سے ایک ہے۔ جنوبی ہند کے بعض ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی آمد و رفت سے قطع نظر، سب سے پہلے مسلمان بڑی تعداد میں محمد بن قاسم کی قیادت میں شمال مغرب کے

Scanned by CamScanner

بحری راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور ۷۱۲ء میں سندھ کو فتح کر لیا۔ یہ مسلمان عربی بولتے تھے، چند وجوہات کی وجہ سے وہ پورے ملک میں نہ پھیل سکے اور تقریباً تین سو سال تک وادیٔ سندھ میں مقیم رہے یہی وجہ ہے کہ سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء) اپنی تصنیف ''نقوشِ سلیمانی'' میں اردو کی جائے پیدائش سندھ کو قرار دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا۔'' [۵]

لیکن علمی ولسانیاتی نقطۂ نظر کے حوالے سے اس بیان میں کچھ صداقت نہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے سندھ کی تہذیب ومعاشرت کے علاوہ وہاں کی زبان کو بھی متاثر کیا۔ لیکن وہ زبان اردو نہ تھی بلکہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جو آج سندھی کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلیمان ندوی کے نظریے کو ماہرین نے درست تسلیم نہ کیا۔

سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۰۰ء اور ۱۰۰۱ء میں پنجاب اور ہندوستان پر پے در پے حملے کیے۔ غزنوی سلطنت کے قیام کے بعد مسلمان سارے پنجاب میں پھیل گئے۔ یہ مسلمان فارسی بولتے ہوئے آئے تھے اور ان میں سے کچھ کی مادری زبان ترکی بھی تھی۔ اس علاقہ پر مسلمانوں نے تقریباً دوسو سال تک قیام کیا۔ اس بنیاد پر حافظ محمود شیرانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ زبان جسے ہم اردو کہتے ہیں سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور وہیں سے ہجرت کر کے دہلی پہنچی، وہ لکھتے ہیں:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چوں کہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔'' [۶]

حافظ محمود شیرانی اپنے اس بیان کے ثبوت میں پنجابی اور اردو صرف ونحو کے تقابلی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔

پروفیسر مسعود حسین خاں نے اپنی تحقیقی تصنیف ''مقدمہ تاریخ زبان اردو'' (۱۹۴۸ء) میں محمود شیرانی کے اس نظریے پر تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ قدیم اردو اور دکنی کی جو خصوصیات حافظ محمود شیرانی پنجابی سے منسوب کرتے ہیں، وہ دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں بالخصوص ہریانی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قدیم اردو کا ''پنجابی پن'' اس کا ہریانی پن بھی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف میں اردو کے برج بھاشا، پنجاب، دکن اور سندھ سے تعلق کو مسترد کر دیا۔ انھوں نے اردو کی ابتداء کا سراغ پانے کے لیے نواحِ دہلی کی بولیوں (ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا اور میواتی) کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کے خیال میں اردو کے ارتقاء میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔

اس لسانیاتی تجزیے سے یہ بات بنیادی نظریے کی صورت اختیار کر جاتی ہے کہ دہلی کے نواح کی یہ

Scanned by CamScanner

بولیاں اردو کا اصل منبع اور دہلی اس کا صحیح مولد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ مسلمان اولاً علاقہ سندھ کے علاوہ سواحل مالابار اور کارومنڈل پر بھی نمودار ہوئے تھے۔ ان عرب مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے درمیان میل جول اور سماجی روابط بھی بڑھتے گئے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ انہی روابط اور سماجی اختلاط کی وجہ سے ایک نئی زبان معرضِ وجود میں آئی جو موجودہ اردو کی قدیم شکل تھی۔

نصیر الدین ہاشمی اپنی تصنیف ''دکن میں اردو'' (۱۹۲۳ء) میں اسی نظریے کو فروغ دیتے نظر آتے ہیں۔ محمد تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دکن پر چڑھائی کی اور اپنا پایہ تخت دہلی سے دولت آباد منتقل کر دیا۔ جس کی وجہ سے دہلی کی ایک کثیر تعداد/آبادی حکماً منتقل ہوئی۔ کچھ عرصے بعد جب دارالسلطنت دولت آباد سے پھر دہلی منتقل ہوا تو بہت سے خاندانوں نے وہاں سے واپس جانا پسند نہیں کیا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ جو زبان لائے وہ یہاں تیزی سے نشو و نما پانے لگی۔ نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو و نما حاصل کرنے لگی کیوں کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی۔ اس کے برخلاف شمال میں برج مروّج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی۔ اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی، عام طور سے پردیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی۔ یہ بات واضح ہے کہ دوآبہ گنگا و جمنا اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے۔ دکن میں جدید زبان جب بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا صرف وہی اثر باقی تھا جو سرزمین برج سے نکلنے سے قبل اس میں قائم ہو چکا تھا۔ غرض کہ اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔'' [۷]

چند سال قبل ڈاکٹر آمنہ خاتون نے ''دکنی کی ابتدا'' (۱۹۷۰ء) کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں انھوں نے دکنی کو اردو سے ایک علاحدہ زبان قرار دیا۔ ان کے خیال میں دکنی نہ تو دہلی میں بولی جانے والی زبان سے ماخوذ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری جگہ سے چل کر دکن پہنچی ہے بلکہ اس کی ابتداء سرزمین دکن سے ہوئی ہے اور یہیں نشو و نما پا کر پروان چڑھی ہے۔ [۸]

اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں ایک اہم نظریہ ڈاکٹر شوکت سبزواری کا ہے، ان کے مطابق اردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے نواح میں گیارہویں صدی عیسوی میں بولی جاتی تھی۔ وہ کھڑی بولی اور ہندوستانی کو ایک ہی زبان تصور کرتے ہیں اور اردو کو اس کی ادبی شکل مانتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ اردو، ہندوستانی اور کھڑی بولی، تینوں کو ایک ہی زبان تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ بھی نظریہ

Scanned by CamScanner

ہے کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی یا دوسرے لفظوں میں اردو مسلمانوں کی آمد سے پہلے دہلی کے بازاروں میں بولی جاتی تھی، وہ لکھتے ہیں:

"اردو ہندوستانی سے ترقی پا کر بنی جو دہلی، میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی جب مسلمان فاتحانہ شان سے دہلی میں داخل ہوئے تو ہندوستانی، دہلی کے بازاروں میں بول چال کی حیثیت سے رائج تھی --- جب یہ زبان ترقی پا کر آگے بڑھی، مسلمانوں کی سرپرستی میں پروان چڑھی، ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تو ہندوستانی کہلائی۔ ہندوستانی کے مولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں سب متفقہ طور سے اسے دہلی اور میرٹھ کی زبان بتاتے ہیں۔ اردو اس کی ادبی شکل ہے، اُردو کھڑی بولی سے ترقی پا کر بنی۔" [۹]

ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو اور پالی کے درمیان بھی مضبوط رشتہ قائم کرتے ہیں:

"پالی اس (کھڑی) کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور فلسفہ کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال لین دین اور کاروبار کی۔" [۱۰]

اردو اور کھڑی بولی کے متعلق ڈاکٹر سہیل بخاری کا نظریہ بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نقطۂ نظر کی تائید کرتا ہے:

"دراصل اردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں، جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ رویوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک پسی اور دوسرا دخیل الفاظ --- علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیوں کہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا --- کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے جیسا ہندی کا۔" [۱۱]

اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں عین الحق فرید کوٹی کے بموجب اردو کا ماخذ دراوڑی اور مُنڈا زبانیں ہیں۔ انھوں نے متعدد غیر ملکی ماہرین سے لسانی شواہد حاصل کر کے پنجابی، منڈاری، دراوڑی اور اردو کے مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی، وہ لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو اور سنسکرت میں کافی حد تک لغوی اشتراک موجود ہے لیکن اس سے یہ یک طرفہ فیصلہ دے دینا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ تمام کا تمام سرمایہ الفاظ سنسکرت ہی نے اردو کو دیا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہوسکتا ہے یعنی خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیش روز بانوں سے اخذ کیے ہوں۔" [۱۲]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"آریاؤں کی آمد کے وقت وادی سندھ میں دراوڑی قبائل کو بالا دستی حاصل تھی ---

Scanned by CamScanner

منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں

آباد تھے۔''[۱۳]

لیکن اس کے باوجود اردو کے آغاز وارتقاء کے حوالے سے تمام نظریات میں حافظ محمود شیرانی کے نظریے کو فوقیت حاصل ہے اور لسانی مباحث میں یہ نظریہ مستقل حیثیت کا حامل بن چکا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر

''حافظ شیرانی کا یہ نظریہ لسانی مباحث میں اب مستقل اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ماہر

لسانیات اس کی تائید کریں یا تردید، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اب

اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ بلاشبہ لسانیات میں یہ عہد آفریں نظریہ ہے۔''[۱۴]

اُردو کی ابتداء و آغاز کے بارے میں یہ نظریات کہاں تک درست ہیں، اس سوال سے قطع نظر ان نظریات نے اُردو تحقیق میں تندی و تیزی پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ جس کی وجہ سے اردو تحقیق کو ایک نئی شکل ملی اور تحقیق کے میدان میں بہت سے در وا ہوئے۔

ہمارے ہاں اُردو کی قدیم تحقیقی روایت میں تحقیق کی کوئی اعلیٰ مثال نہیں ملتی۔ اُردو تحقیق کے مبہم آثار اٹھارہویں صدی سے ملتے ہیں۔ اس زمانے میں شعراء نے جو تذکرے مرتب کیے یا لکھے وہ اُردو میں ادبی تحقیق کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ان تذکروں کے حوالہ سے ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

''یہ تذکرے دراصل بیاضوں ہی کی ایک بہتر شکل ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ تذکرے

معاصرین کے مختصر سوانحی خاکوں پر مشتمل ہیں۔ بعض تذکروں میں تو صرف شاعر کا نام

یا ایک آدھ سطر اور اس کے بعد کلام کے انتخاب میں چند اشعار کا اندراج ملتا ہے۔ یہ

مختصر معلومات بھی غیر مستقیم ماخذ پر مبنی ہیں۔''[۱۵]

لیکن یہ بھی درست ہے کہ یہ نقائص زیادہ تر ابتدائی دور کے تذکروں میں ہیں جوں جوں تذکرہ نویسی کے فن میں ترقی ہوتی گئی مصنفین و مرتبین نے حالات جمع کرنے کا زیادہ التزام کیا۔ بہرحال اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ان تذکروں کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگر یہ تذکرے نہ ہوتے تو جس قدر حالات ہمیں معلوم ہیں یہ بھی ضائع ہو گئے ہوتے۔ ان تذکروں میں شاعروں کا انتخاب ان کی عظمت اور سنجیدگی کے لحاظ سے نہیں کیا گیا بلکہ ان میں چھوٹے بڑے، سنجیدہ، ہزل گو سب طرح کے شاعروں کا ذکر ہے۔ موضوع کے انتخاب میں تذکرہ نگاروں نے کوئی خاص اصول مدِ نظر نہیں رکھا بلکہ جتنے نام مل سکتے تھے انھیں کہیں حروفِ تہجی کی ترتیب اور کہیں ادوار میں تقسیم کر کے قلم بند کر دیا۔ یعنی موضوعِ تذکرہ کا انتخاب بڑی حد تک تذکرہ نگاروں کی مرضی پر منحصر رہا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے حوالہ سے ڈاکٹر سیّد شاہ علی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر زور نے تذکروں کو تذکرہ نگاروں کی مناسبت سے تین قسموں میں تقسیم کیا

ہے۔ جن میں اوّل الذکر دو قسم کے تذکرہ نگار بڑے شاعر یا ان کے عقیدت مند بتائے

Scanned by CamScanner

ہیں اور لکھا ہے کہ قسم اوّل میں بڑے شاعر معمولی شاعروں کو نظر انداز یا ان کے ذکر کو بالکل مختصر کر گئے ہیں۔ دوسری قسم کے تذکرہ نگاروں کو اپنے حلقے اور دبستان کے شاعروں کو ترجیح دینا ہی فطری ہے لیکن مستحسن پہلو ان تذکروں کا یہ ہے کہ ان میں عموماً سخن گوئی کو شرط اور ایک حد تک معیارِ انتخاب قرار دیا گیا ہے۔۔۔۔نظیر اکبر آبادی کو بھی بہت سے تذکرہ نگاروں نے اسی زبان وکلام کے معیار سے نظر انداز کیا ہے۔اس کے علاوہ بعض تذکرہ نگاروں نے صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات قلم بند کرنے اور بعض نے تمام قابلِ ذکر شعراء کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔'' [۱۶]

تذکرہ نویسی کا یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی کے رُبع آخر تک جاری رہا۔ میر تقی میر کے تذکرہ ''نکات الشعراء'' (۱۱۶۵ء) کو اوّلین تذکرہ شمار کیا جاتا ہے۔ دکن میں بھی اس زمانہ میں کئی تذکرے لکھے گئے ان تذکروں میں گلشن گفتار (خواجہ خان حمید ۱۱۶۵ء) تحفۃ الشعراء (مرزا فضل بیگ قاقشال ۱۱۶۵ء) اوّلیت کے حامل ہیں۔ ان کے بعد کے تذکروں میں لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ (چمنستانِ شعراء ۱۱۷۵ء) کو اردو کے نہایت اہم تذکروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ [۱۷] اس دوران محمد حسین آزاد کا اُردو شاعری پر تذکرہ ''آبِ حیات'' ایک بہتر مثال کے طور پر سامنے آیا۔ جس میں شعراء کے سوانحی کوائف کو تفصیل سے بیان کیا گیا، ان کے کلام پر تبصرہ اور تاریخ ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ''آبِ حیات'' تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہے۔ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تحقیق وتنقید کا رنگ موجود ہے۔

اُردو میں ادبی تحقیق کا باقاعدہ آغاز برصغیر پر انگریز حکمرانوں کی ''فروغ علوم مفیدہ'' کی پالیسی ہی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں تو انیسویں صدی عیسوی کے نصف اوّل سے دہلی کالج میں اس پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو چکا تھا۔ تاہم اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید تحریک (علی گڑھ تحریک) کے فروغ سے اردو تحقیق کو ایک نئی جہت ملی۔ علمی سطح پر سرسید احمد خاں کی ''آثار الصنادید'' پہلی تحقیق تھی جس کے دوسرے ایڈیشن میں مواد کو اسناد کے ساتھ درج کیا گیا اور ادارت میں بھی علمی و تحقیقی انداز روا رکھا گیا۔ اگرچہ اس کا تعلق ادبی تحقیق سے نہیں ہے مگر اس سے اُس وقت کے تحقیقی رجحان کی نشان دہی ہوتی ہے۔ تحریک علی گڑھ کے نئے علمی اور سائنسی رویے نے اس دور کے اردو ادب کے مصنفین کو متاثر کیا جو بات کو علمی انداز میں استدلال سے پیش کرنے کی فوقیت دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقائے کار خصوصاً الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کی تحریروں میں تحقیق کے ابتدائی نقوش قدرے واضح انداز میں ظاہر ہوئے۔ ان مصنفین کی کاوشوں سے تحقیق کی روایت میں وسعت پیدا ہوئی اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر کام ہوا۔ اِس دور میں سب سے مُعتبر تحقیقی کام سوانح نگاری کی ذیل میں ہوا۔ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی

Scanned by CamScanner

نے ماضی کی نامور مسلم شخصیات کی سوانح عمریاں لکھ کر اردو تحقیق کو اعتبار بخشا۔ یہ سوانح عمریاں تحقیق کے معیار پر پورا نہ بھی اُتریں تب بھی ابتدائی کوششیں ہونے کے حوالہ سے انتہائی اہم ہیں خاص طور پر اُس عہد میں ایسی تصانیف کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد علی شاہ اُن سوانح نگاروں اور اس صنف کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ''ہردو مصنف اپنی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی تمام تصانیف اردو ادب کا وقیع حصہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سربلندی کا باعث ہیں اور نثر کی تاریخ شاہد ہے کہ سرسید سے پہلے اس میں سوائے صوفیائے کرام کے ملفوظات کے دکنی ادب کی نیم سوانحی اور نیم افسانوی یا سیاسی و مذہبی مثنویوں، شاعروں کے بے سروپا تذکروں اور ایک آدھ نام نہاد تالیف یا ترجمے کے اردو سوانح نگاری بلکہ اردو ادب کی کائنات میں بھی شاید ہی کچھ تھا۔'' [۱۸]

اِس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب میں سوانحی عناصر دوسرے ادبی مراکز کی نسبت دکن ہی میں ملتے ہیں۔ دنیا کی تقریباً ہر ایک زبان کے ابتدائی سوانحی نمونوں کی طرح دکنی ادب پارے بھی منظوم ہیں، خاص طور پر دکن میں لکھی گئی مثنویاں اور ان کے موضوع مذہبی اور سیاسی ہیں مثلاً ''توصیف نامہ'' از فیروز (۹۵۷ سے ۹۸۸ء) ابراہیم قطب شاہ کے ہم عصر اور مُلا وجہی، غواصی، ابن نشاطی وغیرہ ایسے قطب شاہی شاعروں کے پیش رو کی (۹۷۳ء) سے پہلے کی تصنیف ہے جو اردو کی سب سے قدیم سوانح عمری ہے۔ اسی طرح قطب مشتری (مُلا وجہی)، علی نامہ اور تاریخ سکندری (علی عادل شاہ ثانی)، ابراہیم نامہ (عبدل) میں بھی سوانحی عناصر ملتے ہیں۔

سوانح نگاری کی یہ قدیم روایت اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے تاہم اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ اردو ادب میں تحقیق کے رجحان کی ابتداء اِن ہی مصنفین کی کاوشوں سے ہوئی جسے بعد کے مصنفین نے تقویت فراہم کی۔ یوں تحقیق کا کام زبان و ادب کے جس شعبہ اور جس دائرے میں بھی کیا جائے وہ دوسرے کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں ہونے والی اردو تحقیق اگرچہ اس دور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ اور سائنسی بنیادوں پر استوار ہوئی مگر اس کی صحت مند روایت میں اس دور کا برابر حصہ ہے۔

صحیح معنوں میں اردو میں ادبی تحقیق کے سلسلے کا آغاز بیسویں صدی میں شروع ہوتا ہے۔ مغربی تعلیم کے استفادہ سے ادبی تحقیق کے سلسلہ کو سائنسی اندازِ فکر میسر آیا۔ جس سے یہ تحقیق جدید خطوط پر استوار ہوئی۔ اس حوالہ سے اُردو زبان و ادب میں تحقیق کو استحکام بخشنے میں مولوی عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولوی عبدالحق، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ ان اصحابِ علم و دانش کی محنت سے اردو ادب میں جدید تحقیق کا

Scanned by CamScanner

آغاز ہوا۔ ان ارباب اہل نظر نے اردو زبان کی کئی سو سالہ تاریخ کے متعدد گوشوں کی تلاش کی اور مواد کو نئے علمی و ادبی تحقیق کے حوالے سے منظم کر کے منظرِ عام پر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا۔ اردو، فارسی اور عربی کے سرمایے کو بند الماریوں سے نکالا، متون کی ترتیب و تصحیح کی، تاریخ ادب کی گم شدہ کڑیوں کو دریافت کیا، زبان کے آغاز وارتقاء کی نشان دہی کی۔ ادباء اور شعراء کے حالات و واقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس سے تاریخ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا۔'' [۱۹]

ان صاحبانِ تحقیق کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ جدید سائنٹیفک اُصولوں پر متون کو درست کیا جائے تا کہ تاریخ ادب کو مرتب کرنے کے لیے بہتر خام مواد فراہم ہو سکے۔ تحقیق میں اصل کام متون کو صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اگر اردوئے قدیم کے شعراء کا کلام میسر آ جائے تو تاریخ ادب کے راستے متعین ہو سکتے ہیں۔ یہ ان محققین کی اوّلین ترجیح بھی تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

''انھیں اس امر کا احساس تھا کہ اردو ادب کی بے شمار شخصیتیں گوشۂ گم نامی میں ہیں۔ اردو زبان کی ابتداء اور ارتقاء کے کئی مسائل توجہ طلب اور محتاجِ تحقیق ہیں۔ ادب کی کئی جہتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مصنفین کے سوانحی حالات و واقعات پردۂ اخفاء میں ہیں۔ چنانچہ ان کی اوّلین کوششیں یہ تھیں کہ ادبی ذخائر کو دریافت کیا جائے اور انھیں منظرِ عام پر لا کر حقائق کی تاویل و توجیہہ کے عمل کا راستہ وا کیا جائے۔'' [۲۰]

برصغیر پاک و ہند میں نئی ادبی تحقیق کی یہ روایت کئی علمی مراکز میں نظر آتی ہے۔ بلاشبہ اعظم گڑھ، دکن، لاہور، پٹنہ اور رام پور کے تحقیقی دبستانوں میں مختلف نوعیت کے کام کئے گئے۔ اعظم گڑھ تہذیبی اور تاریخی تحقیق کے لیے وقف ہو گیا۔ ان کے یہاں متن کی ترتیب و تحشیہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی بلکہ اخذ و ترجمے پر زور دیا گیا۔ اس مرکز سے سیّد سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، مصباح الدین عبدالرحمٰن، عبدالسلام ندوی اور عبدالحئی کے نام علمی و ادبی تحقیق کے حوالہ سے اہم ہیں۔

لاہور کا ادبی مرکز اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں قائم تھا۔ ابتداء میں یہاں عربی، فارسی اور سنسکرت پر تحقیقی کام ہوئے۔ بعد ازاں اردو زبان و ادب پر بھی کام شروع کیا گیا۔ اس مرکز نے اردو ادب کی تحقیقی روایت کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

''یہ تحقیقی روایت حزم واحتیاط کا اچھوتا معیار پیش کرتی ہے۔ فراموش شدہ مصنفین کے حالات کی تلاش عام اور مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین تمام معلومہ مواد کو جرح اور تعدیل کی کسوٹی پر کسنا، حوالے لقلم بند کرنے میں کامل احتیاط، اس گروہ کا

Scanned by CamScanner

امتیازی کارنامہ ہے۔'' [۲۱]

دبستانِ لاہور کے محققین کسی بھی محقق کے لیے مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے مطالعے کو ضروری قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک ادب کوئی جداگانہ اکائی نہیں معاشرتی علوم کے وسیلے سے ہی ادب کے مختلف رشتے دریافت ہوئے ہیں۔ خصوصاً تاریخ کو ان کے تحقیقی نظام میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ ادب سے حاصل شدہ واقعات، سنین اور حالات وکوائف کو تاریخ کی مدد سے دریافت شدہ مواد کے ساتھ تطبیق دے کر مقالہ نگاری کی روایت کا آغاز ہوا اور محنت کو تحقیق کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ جس سے سہل انگاری کا خاتمہ ہوا۔ مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳-۱۹۶۳ء) اور حافظ محمود شیرانی (۱۸۸۸-۱۹۴۵ء) نے اس مرکز میں اردو تحقیق کی روایت قائم کرنے اور ادبی تحقیق کا معیار بلند کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ مولوی محمد شفیع کا زیادہ تر کام پرانے متون کی ترتیب وتحشیہ تک محدود رہا۔ تاہم تحقیقی خوبیوں کے باعث ان کا کام انتہائی معیاری ہے۔ ان کے نزدیک ماخذ اور مصادر کو اوّلین حیثیت حاصل ہے۔

حافظ محمود شیرانی ایک ممتاز عالم اور عظیم محقق تھے، ان کی تحقیقات کے میدان متنوع اور وسیع تھے۔ انھوں نے لغات، قواعد، رسم الخط، عروض، شعروادب، تذکرہ، سوانح، تاریخ اور لسانیات کے بارے میں گراں قدر تحقیقی وتنقیدی مضامین تحریر کیے۔ مالک رام اُن کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ''مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی اور ان کے ہاں وہ منطقی انداز نظر موجود تھا جس کے بغیر انداز گفتگو میں صحت اور استخراج نتائج آ ہی نہیں سکتا۔ زورِ یقینی، آسان پسندی اور کم نظری سے انھیں علاقہ نہیں تھا۔ تحقیق اور تدوین دونوں موضوعات پر ان کا بیشتر کام مثال ومعیار کی حیثیت رکھتا ہے۔'' [۲۲]

اُردو کے تمام مستند اور معتبر محققین کے ہاں حافظ محمود شیرانی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں تحقیق وتدوین کی روایت نہ صرف جدید خطوط پر استوار ہوئی بلکہ اس کا انداز بھی سائنٹیفک ہو گیا۔ جس سے یہ میدان نہ صرف دلچسپ ہو گیا بلکہ رام پور اور پٹنہ ایسے علمی مراکز سے بہت سے محققین سامنے آئے۔ قاضی عبدالودود (۱۸۹۸-۱۹۸۴ء) نے اپنے مضامین میں نہایت عرق ریزی اور دیدہ وری سے صحیح حقائق کو پیش کر کے تحقیقی کام کی ایک نئی جہت پیش کی۔ ادبی تحقیق میں ان کی سخت گرفت نے اردو تحقیق کا مذاق اور معیار بلند کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالودود صاحب سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہی کے اصولوں اور قواعد کی پابندی باقی محققین کے ہاں نظر آتی ہے۔ قاضی صاحب نے ثانوی ماخذ سے بالعموم صرفِ نظر کیا اور اپنی تحقیق وتدقین کو معاصر مواد تک محدود کر دیا۔ ہر حوالے میں احتیاط کا عنصر قاضی صاحب کے ہاں بہت ہے۔'' [۲۳]

پٹنہ کے دبستان نے ترتیب متن میں بہت کام کیا جس کا معیار کسی بھی دبستان کی تصانیف سے کسی

Scanned by CamScanner

رام پور کے دبستان میں بھی تحقیق کے حوالہ سے بہتر اور مثالی کام ہوئے اس دبستان میں امتیاز علی عرشی کو متن کی تصحیح کے حوالہ سے انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ مکاتیب غالب، مسلک گوہر اور دستور الفصاحت اس کی قابلِ قدر مثالیں ہیں۔ طرح کم نہیں ہے۔

ان تمام دبستانوں نے تحقیق کو فروغ دینے اور اس کے لئے بہتر سے بہتر معیارات مقرر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ کسی بھی دبستان کی تحقیقات کو غیر معیاری نہیں کہا جا سکتا۔ ہر مرکز کے محققین نے اپنے مزاج، علاقائی تقاضوں، ادبی ماحول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحقیق کے میدان میں خامہ فرسائی کی۔ بیسویں صدی میں ادبی تحقیق کی روایت ایک جان دار اور توانا حیثیت رکھتی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں ملنے والے اُردو ادب کے مبہم آثار اب باقاعدہ صورت میں واضح طور پر سامنے آ چکے ہیں۔ ان تمام علمی مراکز کی اہمیت سے کسی ذی شعور کو مفر نہیں تاہم علمی مرکز ''دکن'' نے تحقیق کی اس روایت کو مضبوط اور بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔

یہ علمی مرکز صدیوں سے بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور دیگر ریاستوں کے سلاطین کے ادوار میں گلبرگہ، بیدر، گولکنڈہ، بیجاپور، گوگی، احمد نگر، قندھار، بودھن، میسور، کڑپہ، کرنول، ویلور، مدراس، اورنگ آباد، برہان پور کے علاقوں میں اردو شعر و ادب کے بھرپور فروغ کے باعث ایک مستقل دبستان کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا اور مختلف اصناف کے مولد ہونے کا اعزاز بھی اسی مرکز کو حاصل ہے۔ مسلم اقتدار کے چھ سو سالہ دور میں دکن کے درباروں سے منسلک شعراء و ادباء نے اپنی فطری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے ذخیرہ میں بے پناہ اضافہ کیا۔ یہ کارنامے اپنی تمام تر توانائیوں اور خوبیوں کے باوجود امتدادِ زمانہ کا شکار ہو گئے۔

دکنیات سے متعلق تحقیقات کا آغاز--- اُردو تحقیق کے متعدد موضوعات کی طرح مشہور مستشرق گارساں دِتاسی ہی سے ہوتا ہے، جو پیرس کی یونیورسٹی سوبورن میں اُردو کے استاد تھے۔ انھوں نے (۱۸۳۱ء) میں پہلے پہل دیوانِ ولی مرتب کر کے شائع کیا۔ پھر جب اس نے اولاً دو جلدوں میں اور بالآخر تین جلدوں میں اُردو ادب کی تاریخ تصنیف کی اور پھر اپنے خطبات ترتیب دیئے تو دکنی زبان اور دکن سے تعلق رکھنے والے شاعروں، مصنفوں اور ان کی تصانیف کو بھی متعارف کروایا اور وہ زندگی بھر اردو کے قدیم ادب کی تحقیق و تنقید میں مصروف رہا اور ہمارے شعراء اور ادباء کی خدمات کا تنقیدی و تحقیقی نظر سے جائزہ لیا۔ اس کے کتب خانے میں دکنی ادب سے متعلق قلمی کتابوں کا اچھا ذخیرہ موجود تھا۔ تاہم سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بھی چند ماہرین لسانیات نے اس جانب توجہ دی۔ یوں تحقیق کا آغاز تو سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہو چکا تھا جسے تقویت اُنیسویں صدی میں حاصل ہوئی اور عروج بیسویں صدی میں ملا۔ دکنی ادب کی تحقیق کے حوالہ سے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں:

''پہلا دور جیسے کہ میں نے عرض کیا، سترہویں، اٹھارہویں صدی کے اوائل اور اواخر کا

Scanned by CamScanner

دور ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یورپ میں والملک روس، جیکب گرم، میکس مولر جیسے
ماہرین لسانیات پیدا ہوئے، جنھوں نے ہندوستان وایشیاء کی جدید وقدیم زبانوں
سے دلچسپی لینا شروع کی اور سنسکرت، عربی، فارسی، مراٹھی، بنگالی، حتیٰ کہ دراوڑی
زبانوں، تلنگی، کنٹری، تمل وغیرہ پر تحقیقات شروع کیں۔'' [۲۴]

دکنی زبان وادب کے حوالہ سے کام کرنے والے مستشرقین میں سائمن ڈک، رچرڈ ایٹن، ڈیوڈ میتھیوز، گیری سن، روبک، بلوم ہاٹ وغیرہ نے دکنی صوفیاء، دکنی ملفوظات، دکنی نقشبندی ملفوظات، قلی قطب شاہ، دکنی اور اُردو زبان کا مطالعہ ایسے موضوعات کو اپنی تحقیق کا حصہ بنایا۔ اس ابتدائی دور کے بعد اُنیسویں صدی میں دکنیات سے متعلق چند کتابیں، پنچھی نامہ (وجیہہ الدین) ہشت بہشت (محمد باقر آگاہ) دکنی انوار سہیلی (منشی محمد ابراہیم) وغیرہ منظر عام پر آئیں۔ جس سے قدیم اردو کے نایاب نقوش تلاش کرنے کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا کیوں کہ اردو زبان کے آغاز کا کھوج لگانے کے دوران دکنی زبان کے ساتھ دکنی ادب بھی بطور ماخذ، تحقیق کا موضوع بنا۔

مشرقی علوم میں تحقیق کی روایت بہت کچھ اس سوسائٹی کے ہاتھوں مستحکم ہو چکی تھی۔ تحقیق کی لسانی روایت بیسویں صدی کے علمی و تحقیقی اداروں میں سرایت کر گئی تھی اور مقامی ضرورتوں کے مطابق لسانی بنیادوں پر اُردو زبان کا تحقیقی مطالعہ ہونے لگا۔ اس مقصد کے لیے دکن کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں اردو کی ادبی اور لسانی روایت کو بھرپور فروغ حاصل ہوا۔

جدید علم کی حیثیت سے اردو لسانیات پر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی دو کتابوں ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' کو علم لسانیات کے حوالہ سے استناد کا درجہ حاصل ہے۔ اس موضوع کی طرف توجہ دینے والے وہ اوّلین شخص تھے۔ ڈاکٹر زور کی ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''ہندوستانی صوتیات'' اردو کی لسانی تحقیق میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر زور کی اوّلیت اس میں ہے کہ انھوں نے اس وقت لسانیات کے موضوع کی طرف توجہ کی جب اردو ہی نہیں ہندی کے علماء کو بھی اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ [۵۶] دیگر ادبی شخصیات میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحقیقی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ جن کے کارنامے اپنے معیار اور اوّلیت کے اعتبار سے اہم ہیں جن سے ہر عہد کے ادیبوں نے استفادہ کیا۔۔۔ ''ان صاحبانِ تحقیق نے لسانیات پر نہایت اہم کام کئے اور اس علم کو توانائی بخشی۔ ان ہی خطوط پر آگے چل کر ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لسانیات کو اپنا مستقل موضوع بنالیا اور سائنسی اندازِ فکر کو فروغ دیا۔'' [۲۵]

ڈاکٹر محمد علی اثر اس حوالہ سے لکھتے ہیں:

''دکنی ادب پر تحقیقی کام کے دوسرے مرحلے کا آغاز ۱۹۶۵ء میں ہوا جب کہ
ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے رفقاء کے تعاون سے ایک تحقیقاتی مجلّے ''قدیم اردو''

کا اجراء کیا۔ اس سے پہلی بار قدیم ادب کی منتخب تخلیقات کے متون کو مختلف نسخوں کے باہمی مقابلہ کے بعد متنی تنقید کے جدید اصولوں کی روشنی میں صحت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔'' [۲۶]

دبستانِ دکن نے اُردو کی تحقیقی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ دکن میں اردو تحقیق کی اس روایت کو فروغ مولوی عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری، عبدالجبار صوفی ملکاپوری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مولوی سیّد محمد، عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، اکبرالدین صدیقی، سعادت علی رضوی، نجیب اشرف ندوی، مولوی نصیرالدین ہاشمی کی شبانہ روز محنت سے بیسویں صدی کے اوائل میں ملا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی علمی و تحقیقی مطالعے اور تالیف و تصنیف میں صرف کر دی۔ ان کی اعلیٰ تحقیقی کاوشوں سے اُردو زبان و ادب کے نامعلوم گوشے سامنے آئے اور گم شدہ اوراق مرتب ہوئے۔ دیگر علمی مراکز کو حاصل امتیازات کی طرح دکن کو بھی لسانیات اور قدیم متون کی تدوین اور بازیافت کے حوالہ سے اہمیت حاصل ہے۔ اس تحقیقی مرکز سے بہت سے قدیم متون اور تذکروں کو مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ جن کی اشاعت سے اردو کے ارتقاء کی مختلف منازل اور مدارج کا تعین اور تحقیق کے لیے راستہ ہموار ہوا۔

قدیم اردو کے ادب پاروں کو تلاش کرنے میں محققین نے جس محنت، لگن اور جانفشانی کا ثبوت دیا اس سے دکنیات کا باقاعدہ مطالعہ ادب کی روایت بن گیا۔ یقیناً یہ تمام تحقیق غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ ان محققین کی خدمات کا اعتراف ڈاکٹر سیّدہ جعفران الفاظ میں کرتی ہیں:

''بہمنی دور اور پھر عادل شاہی و قطب شاہی عہد کے باکمال شعراء کے جو کارنامے مرورِ زمانہ کے گرد و غبار میں ہماری نظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔ انھیں دکن کی روایات تحقیق کا بھرم رکھنے والی قابلِ قدر نسل نے روشناس کرایا۔'' [۲۷]

دکن کے علاوہ مختلف ریاستوں بمبئی، بنگلور، میسور، الٰہ آباد کے محققین نے بھی اپنی بھرپور محنت سے دکنی تحقیق کے سرمائے میں قابلِ قدر اضافے کیے۔ دکن کے اس علمی مرکز سے شاعری، تاریخ، مذہب، تصوف، ایسے موضوعات پر بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔ تاہم ان محققین کے پیشِ نظر زیادہ تر دکنی شاعری کے نمونے ہی رہے۔ انھوں نے نصرتی، برہان الدین جانم، غواصی، حسن شوقی، عبدل، شاہ ابوالحسن، فیروز بیدری، احمد گجراتی، علی عادل شاہ ثانی، امین الدین اعلیٰ، احمد جنیدی، ہاشمی، فخرالدین نظامی، قلی قطب شاہ، صنعتی، فراق بیجاپوری، ابراہیم عادل شاہ، ابن نشاطی وغیرہ کی شعری تخلیقات کو تحقیق و تدوین کے بعد علمی و ادبی حلقوں میں متعارف کروایا جب کہ دکن کے شعری سرمائے کی نسبت نثری کارنامے کم دریافت ہوئے۔ دوسرے اس کی طرف توجہ بھی کم دی گئی تاہم دکن کے نثری سرمایے کی تلاش کا سلسلہ موقوف نہیں ہوا بلکہ تاج الحقائق (وجیہہ الدین) معراج العاشقین (خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) کلمۃ الحقائق (برہان الدین جانم) بحر الحقائق (وجیہہ الدین) وغیرہ نثر کے

Scanned by CamScanner

ابتدائی اور اہم کارناموں کے طور پر سامنے آئے۔

بیسویں صدی میں محققین کی کثیر تعداد نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر دکنی ادب کی روایت تحقیق کو خوب مستحکم کیا۔ کئی سرکاری و نجی اداروں نے نہ صرف دکنی ادب کے فروغ کے لیے کوششیں کی بلکہ اپنی تحقیقات سے اس خطہ (دکن) کے ادبی مقام و مرتبہ میں بھی خوب اضافہ کیا۔ ان اداروں میں جامعہ عثمانیہ، مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات، انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیات اردو، دارالترجمہ، دائرۃ المعارف وغیرہ نے قدیم ادب کی تلاش و تحقیق کے حوالے سے اہم کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کے علاوہ سینٹ جوزف کالج اور ہندی پرچار سبھا نے دکنی کارناموں کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ ان اداروں میں جامعہ عثمانیہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جہاں اس نے دکن کی علمی، ادبی، سماجی فضا پر گہرے اثرات مرتب کئے وہیں محققین کی کثیر تعداد بھی یہاں سے میسر آئی۔ ان تمام اداروں نے دکنی ادب کی بازیافت کے حوالے سے بھرپور خدمات انجام دیں۔ حکیم شمس اللہ قادری، مولوی عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، اکبرالدین صدیقی، محی الدین قادری زور کے بعد بھی محققین کی ایک کثیر تعداد نے اس تحقیقی روایت کو مزید آگے بڑھایا۔ ان محققین میں ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر آمنہ خاتون، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر خالدہ یوسف، شری شرما راؤ (ہندی میں) ڈاکٹر غلام عمر خاں؛ ڈاکٹر حسینی شاہد، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر ہاشم علی، ظہیرالدین مدنی، نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر جاوید وشسٹ، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، نے دکنی ادب کی بازیافت کے حوالہ سے اپنے مضامین اور مرتبہ و مدونہ کتب میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا، جن کے تحقیقی کارنامے بلاشبہ دکنیات کے فروغ کے لیے تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی، (مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی، قدیم اردو کی لغت،، شیخ چاند ابن حسین (تمتہ پھول بن، خاور نامہ)۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل (بپتی کہانی، مدح و قدح دکن، دکن اور ایران) ڈاکٹر نزہت اکرام (ڈاکٹر سیّد غلام محی الدین قادری زور- حیات اور علمی و ادبی کارنامے) شفقت رضوی (دیوان ماہ لقا بائی چندا) افسر صدیقی امروہوی (بیاض میراثی، مثل خالق باری، دیوان قاسم، سنگھاسن بتیی، نوسر ہار) تحسین سروری (معراج العاشقین) سخاوت مرزا (من لگن)، قدرت نقوی (سب رس)، سلطانہ بخش (دیوانِ تراب) وغیرہ نے دکنی ادب کی تلاش و تحقیق کے سلسلہ کو بخوبی سر انجام دیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اوّل) پنجاب یونیورسٹی کی مرتبہ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و بھارت'' (اُردو ادب، جلد اوّل) ڈاکٹر عبدالسلام کی مرتبہ یارِخ ادبِ اردو (جلد اوّل) اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ'' دکنی ادب اور دکنی زبان و ادب کے تمام ادوار کا احاطہ کرتی ہیں۔ تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیقی کارناموں کو دکنی ادب کی بازیافت کے حوالہ سے تاریخ ادب و دکنیات میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ پاکستان میں قدیم اردو کی تلاش و تحقیق کا

Scanned by CamScanner

سلسلہ عام نہ سہی لیکن پھر بھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر قدیم دکنی ادب کی بازیافت کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ خواجہ حمیدالدین شاہد، سخاوت مرزا، ڈاکٹر عمر خالدی، ڈاکٹر اکرام چغتائی، افسر امروہوی، تحسین سروری، قدرت نقوی، رشید شکیب، سہیل بخاری، ایسے بیسیوں اصحابِ علم ہیں جن کے دکنی زبان وادب کے حوالہ سے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب بھی مختلف جامعات سے وابستہ اساتذہ اور طلباء اس سرزمین کے ادبی گوشوں کو کھوجنے میں مصروف ہیں۔ جامعات سے باہر بھی لوگ قدیم ادب کی تلاش وتحقیق میں سرگرداں ہیں۔ تاہم چند اصحاب ایسے ضرور ہیں جنھوں نے دکنیات کے باقاعدہ مطالعہ کو اپنی علمی وادبی اور تحقیقی وتدوینی زندگی کا حصہ بنایا۔

ہندوستان میں دکھنی کارناموں کی ترتیب وتہذیب زیادہ تر ریاست حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے متوسلین کے ہاتھوں عمل میں آئی جب کہ اداروں کے ضمن میں انجمن ترقی اردو، جامعہ عثمانیہ، مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات، ادارہ ادبیات اردو وغیرہ نے اس مہم کو آگے بڑھایا۔ قدیم ادب کی تلاش کے سلسلہ میں سب سے اہم کارنامہ قدیم مثنویوں اور دواوین کی تدوین ہے۔ دوسرے ادبی تواریخ اور مختلف کتب خانوں میں موجود مخطوطات کی فہرستوں کی ترتیب ہی وہ کارنامے ہیں جو دکن میں انفرادی اور اجتماعی تحقیق کا نتیجہ ہیں اور جن کی وجہ سے اس علاقے کو اس کا جائز مقام ملا۔ اردو ادب اور خصوصاً دکنی ادب سے متعلق تحقیق کرنے والوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے، جنھوں نے نہ صرف دکن میں بیٹھ کر بلکہ دوسرے علاقوں میں رہتے ہوئے بھی قدیم دکنی ادب کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی بازیافت میں خصوصی دلچسپی لی۔ جس سے دکنیات کا ایک بڑا ذخیرہ ادبی دنیا کے سامنے آ گیا۔

جس طرح اردو زبان کا پہلا ادب سرزمین دکن میں تخلیق ہوا، اُسی طرح اردو تحقیق کی روایت کا آغاز بھی یہیں سے ہوتا ہے۔ دکنی ادب کی تحقیق و دریافت کی روایت کو آگے بڑھانے میں مولوی عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری، عبدالجبار صوفی ملکاپوری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری، سید محمد، ڈاکٹر سیدہ، جعفر، اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ایسے محققین اور انجمن ترقی اردو، دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو، ایسے اداروں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ محققین اور ادارے نہ صرف دکنی زبان وادب کے دور کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ جدید تحقیقات اور معلومات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

حواشی و حوالہ جات

[۱] نصیر احمد خاں ۔ اردو لسانیات، دہلی، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (س ن)، ص ۱۳

[۲] سلیم اختر، ڈاکٹر ۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء، ص ۶۴

[۳] آزاد، محمد حسین ۔ آبِ حیات، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰

[۴] خلیل بیگ مرزا ۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۴، ۲۵

[۵] ایضاً ص ۱۴

[۶] محمود خان شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو (حصہ اوّل)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۸

[۷] نصیر الدین ہاشمی ۔ دکن میں اردو، نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰-۱۶

[۸] خلیل بیگ مرزا ۔ اردو کی لسانی تشکیل، ص ۲۳

[۹] ایضاً ص ۲۸، ۲۹، ۳۱

[۱۰] عین الحق فرید کوٹی ۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور، اورینٹ ریسرچ سینٹر، ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۲

[۱۱] ایضاً ص ۹۶

[۱۲] سلیم اختر، ڈاکٹر ۔ اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ص ۶۸

[۱۳] ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر ۔ اردو میں اصول تحقیق (حصہ اوّل)، اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۳۸۰

[۱۴] سیّد علی شاہ، ڈاکٹر ۔ اردو میں سوانح نگاری، کراچی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۸، ۱۱۹

[۱۵] سید محمد ۔ دکن میں تذکرہ نویسی مشمولہ مجلّہ ''عثمانیہ'' دکنی ادب نمبر ۶۴-۱۹۶۳ء، ص ۷۶-۷۷

[۱۷] اکرام چغتائی، ڈاکٹر ۔ حافظ محمود شیرانی، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص

[۱۸] سیّد شاہ علی ۔ حالی اور شبلی سوانح نگاری کی حیثیت سے، مشمولہ ''اردو نثر کا فنی ارتقا'' ۱۹۹۴ء، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص ۳۳۲

[۱۹] سیّد شاہ علی ۔ اردو میں سوانح نگاری، ص ۱۱۳-۱۱۴

[۲۰] وحید قریشی، ڈاکٹر ۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، لاہور، مکتبہ ادبِ جدید، ۱۹۶۵ء، ص ۹

[۲۱] ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر ۔ اردو میں اصولِ تحقیق (حصہ اوّل)، ص ۳۸۴

[۲۲] وحید قریشی، ڈاکٹر ۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۱۱

[۲۳] مالک رام ۔ مشمولہ ''اردو میں اصولِ تحقیق'' (جلد اوّل)، ص ۳۸۸

[۲۴] وحید قریشی، ڈاکٹر ۔ سہ ماہی 'صحیفہ' (اداریہ) شمارہ نمبر ۴۵، اکتوبر ۱۹۶۵ء، ص (ب)

[۲۵] محمد علی اثر، ڈاکٹر ۔ دکنی شاعری ۔ تحقیق و تنقید، حیدرآباد، کاشانہ اثر، ۱۹۸۸ء، ص ۸

[۲۶] سیّدہ جعفر، ڈاکٹر ۔ ڈاکٹر زور، دہلی، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱

[۲۷] محمد علی اثر، ڈاکٹر ۔ دکنی شاعری ۔ تحقیق و تنقید، ص ۳۶

[۲۸] رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر ۔ دکنی نثر میں تحقیق کے مسائل مشمولہ ''فکر و تحقیق'' جلد ۱، شمارہ ۱، جون ۱۹۸۹ء، ص ۱۸

[۲۹] سیّدہ جعفر، ڈاکٹر ۔ دکنی ادب کی تحقیق کے چند مسائل مشمولہ ''فکر و تحقیق'' جلد ۱، شمارہ ۱، جون ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۳

Scanned by CamScanner